۸ر فروری ۱۹۷۱ء

ہفتہ وار
ہماری زبان

جلد ۳۰ | ایڈیٹر آل احمد سرور | شمارہ ۷

اس شمارے میں

پروفیسر آل احمد سرور

خطبۂ صدارت

(رسم خط سیمینار دہلی یونیورسٹی)

(۲۹ر جنوری ، ۱۰ بجے سہ پہر)

یادش بخیر اکبر الٰہ آبادی نے ایک قطعے میں آنے والے چند خطرات کا ذکر کرتے ہوئے رسم خط کی تبدیلی کے سلسلے میں اپنے خدشے کا اس طرح ذکر کیا تھا۔

نہ پیدا ہوگی خطِ نسخ سے شانِ ادب آگیں
نہ نستعلیق حرف اس طرح سے زیبِ رقم ہوں گے

اکبر ہر تبدیلی سے خائف تھے یہاں تک کہ پائپ کا پانی پینے سے اور ٹائپ میں تحریر پڑھنے سے لیکن سچی بات یہ ہے کہ انھیں اپنی تہذیب اور زبان سے بڑی محبت تھی اور اس کو کسی طرح پامال ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اکبر عاشق بھی تھے اور عارف بھی اس لئے انھوں نے عرصہ ہوا جو کچھ زبان و ادب کے سلسلے میں کہا تھا، آج بھی ہمارے لئے اس کی بڑی اہمیت ہے تہذیبی سرمایے میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے مگر تہذیب کے بنیادی عناصر باقی رہتے ہیں، تہذیب کی بنیاد ہل جائے تو انسان کی شخصیت کا رنگ محل ڈانواں ڈول ہو جائے۔ تہذیب میں زبان کو جو اہمیت حاصل ہے وہ سب پر روشن ہے۔ زبان صرف معلومات کے اظہار کا ذریعہ نہیں، خیال کی تخلیق اور ترسیل کا ذریعہ بھی ہے۔ پھر یہ جذبے کی جان بھی ہے اور علامت کے رمز و ایما کی کان بھی۔ کوئی شخصیت اس وقت تک اپنے پورے قد کو نہیں پہنچ سکتی جب تک اس کے منہ میں اس کی اپنی زبان نہ ہو۔ زبان پر قدرت کے بغیر نہ خیالات کی پرواز ممکن ہے، نہ علم کی صحت، نہ ادب کی جادوگری۔ اور یہاں مانگے کے اجالے سے کام نہیں چلتا۔ اپنے لہو کا چراغ جلانا پڑتا ہے، اپنے باطن میں جھانکنا پڑتا ہے اپنے سرمایے پر تکیہ کرنا پڑتا ہے۔ دوسروں کی زبانیں سیکھ کر ہم عالم فاضل بن سکتے ہیں مگر اپنے گھر کا چراغ نہیں بن سکتے۔ اپنے باغ کا پھول نہیں کہلائے جا سکتے۔ ہم میں علم آسکتا ہے، بصیرت نہیں آسکتی۔ ہم معلومات کی مشینیں بن سکتے ہیں، انسان نہیں بن سکتے۔

مالی نوسکی نے کہا ہے کہ دنیا کی سب زبانیں بالقوۃ برابر ہیں۔ ہر ایک میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ افکار و اقدار کی اعلیٰ ترین منزلوں تک پہنچ سکے۔ ابتدائی قبائل کی چھوٹی چھوٹی اور بکھری ہوئی زبانوں کو موقع ملتا تو انگریزی، فرانسیسی، ہسپانوی، روسی، عربی، چینی جیسی زبانوں سے ہمسری کر سکتی تھیں۔ اس لئے ہر زبان برابر ہے۔ زبان کی عظمت بولنے والوں کی تعداد سے نہیں، اس کے ادب کی بلندی، اس کے افکار و اقدار کی ہمہ گیری، اس کے علمی سرمایے کی وسعت اور گیرائی اور اس کے فنکاروں کے گنجینۂ معنی کے طلسمات سے متعین ہوتی ہے۔ ہندوستان میں بہت سی زبانیں ہیں۔ یہ سب قومی زبانیں ہیں اور کسی کو نہ کسی پر فوقیت ہے نہ کوئی کسی معنی میں کسی سے کمتر ہے۔ ہاں یہ بالکل دوسری بات ہے کہ سہولت کے لئے کسی ایک زبان کو رشتے کی زبان (LINK

اشاعت کی تاریخیں
۱، ۸، ۱۵، ۲۲

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

فی کاپی: ۱۵ پیسے
قیمت سالانہ: ۵ روپے

LANGUAGE) کے طور پر استعمال کیا جائے۔ اگر سب زبانوں کے بولنے والے ہندی کو (LINK LANGUAGE) مان لیں تو ہندی کو یہ درجہ ملنا چاہئے۔ اگر لوگوں کا یہ اصرار ہو کہ جب تک ہندی پر سب کا اتفاق نہ ہو، انگریزی کی موجودہ حیثیت برقرار رہے تو سنجیدہ اور معقول اردو والے بھی انگریزی اور ہندی کو ساتھ ساتھ چلانے پر زور دیں گے۔ اردو کا جھگڑا نہ ہندی سے ہے نہ بنگالی سے نہ تامل سے۔ اردو کسی زبان کی جگہ لینا نہیں چاہتی یہ اپنا جائز حق اور مناسب درجہ چاہتی ہے۔ سچی قومیت کسی زبان کو دبانے میں نہیں، ہر زبان کو اس کا مناسب درجہ اور حق دینے میں ہے۔ بات سیدھی سادی ہے مگر جب تعصب اور تنگ نظری کی عینک چڑھی ہوتی ہو تو یہ سیدھی اور سچی بات لوگوں کو نظر نہیں آتی مگر ہمیں تو ہر حال میں اپنی بات کہے جانا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ بالآخر حق و صداقت کی آواز کو دبایا نہیں جاسکتا۔

اردو ایک جدید ہندوستانی زبان ہے۔ یہ نہ ہندی کی تشکیل ہے نہ عربی، فارسی کی ذیلی تعمیر۔ یہ کھڑی بولی کی بنیاد پر پروان چڑھی۔ یہ واقعہ ہے کہ کھڑی بولی کا ابتدائی ادب اور درمیانی ادب بیشتر اردو کا ہے۔ جدید ہندی تو، خواہ لوگ کچھ کہیں، انیسویں صدی کے آغاز سے شروع ہوتی ہے۔ اردو اور ہندی کا قریبی تعلق ہے۔ یہ دونوں بہنیں ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئیں۔ ان کے نقش و نگار اور خط و خال میں خاصی مشابہت بھی ہے مگر ان دو بہنوں میں سے ایک کو راج سنگھاسن پر بٹھانا اور دوسری کو ٹھکرانا، تہذیب، ادب و انسانیت سبھی کی شریعت میں قابل اعتراض ہے۔ یہ اردو زبان جب سے وجود میں آئی اس رسم الخط میں لکھی گئی جسے آج ہم اردو رسم خط کہتے ہیں۔ کیا ہوا اگر یہ رسم الخط عربی اور فارسی رسم الخط پر مبنی ہے۔ عربوں اور ایرانیوں سے ہم نے بہت سی چیزیں لی ہیں مگر ان چیزوں کو اپنے طور پر برتا ہے۔ ہم نے فارسی رسم الخط میں متعدد حرفوں کے اضافے کرکے اسے اپنا رسم الخط بنا لیا ہے۔ اب یہ اردو رسم الخط ہے۔ اسے فارسی یا عربی رسم الخط نہیں کہنا چاہئے۔ یہ صحیح ہے کہ بالکل شروع میں اور آجکل اردو کی بہت سی کتابیں دیوناگری رسم الخط میں بھی ملتی ہیں۔ اردو کے لئے رومن رسم الخط بھی استعمال ہوا ہے اور فوج میں تو بہت عرصے تک اس کا رواج رہا ہے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی نے اپنے مقالے میں ایسی بہت سی ہندی کتابوں کی نشان دہی کی ہے جو پہلے اردو رسم الخط میں لکھی گئیں۔ اس لئے اگر کسی موقعے پر اردو کے لئے دیوناگری رسم الخط استعمال ہوا ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم اسے اردو رسم الخط کے بجائے اپنا رسم الخط مان لیں۔ اس منطق کی رو سے تو اردو رسم الخط ہندی کے لئے بھی استعمال کرنے کی دلیل نکل آتی ہے مگر ابتدائی دور کی طفلانہ باتوں کو لوگ جوانی میں ترک کر دیتے ہیں۔ آدمی اپنے بچپن سے نہیں اپنی جوانی سے پہچانا جاتا ہے جب اس کا کردار بن جائے اور اس کی شخصیت مکمل ہو جائے۔ اردو کے لئے صدیوں سے موجودہ رسم الخط استعمال ہو رہا ہے۔ اب یہ وہ جلد ہے جو زبان کے جسم پر ہے۔ اس جلد کو آپ بدل دیں تو زبان کے جسم کو آنچ آئے گی۔ رسم الخط کوئی لباس نہیں ہے کہ ایک اتارا اور دوسرا پہن لیا۔ یہ کوئی غلاف نہیں ہے کہ ایک علیحدہ کیا اور دوسرا چڑھا دیا۔ اگر ڈرنگر کا یہ قول صحیح ہے کہ فن تحریر تہذیب انسانی کی کلید ہے تو رسم الخط اس تحریر کا کوڈ یا قفل ہے۔ جب تک یہ قفل نہ ہو آپ کلید سے صحیح کام نہیں لے سکتے۔

رسم الخط صرف علم نہیں دیتا ذہنی کشادگی اور نفسیاتی طمانیت بھی عطا کرتا ہے۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ کچھ لوگ الفاظ کے معنی جانتے ہیں مگر شعر کا مطلب نہیں بتا سکتے۔ یہ ماورائے شاعری اور ماورائے سخن بات جو ذہن بتاتی ہے اور ذہن کی ساری اعصابی توانائی سے عبارت ہے۔ اسی رسم الخط کے ذریعہ سے ممکن ہے جس سے ہم مانوس ہیں جو ہمیں صرف استاد نے نہیں پڑھایا، بلکہ ہم نے گھر کی کتابوں میں دیکھا، دیواروں پر میں پایا، مراسلات کو ماں باپ کے حوالے کرتے ہوئے دیکھا، اور خود حرف پہچاننے سے پہلے ہم جس سے آشنا ہوئے۔ اس لئے میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ آپ اردو دیوناگری یا رومن رسم الخط کے ذریعے بھی پڑھا سکتے ہیں۔ آپ بے شک کچھ الفاظ، کچھ اسباق، کچھ حکایتیں، کچھ کاروباری باتیں سکھا دیں گے، مگر پڑھنے والوں کو اردو زبان اچھی طرح نہیں آئے گی اور ادب کی روح تک تو ان کی رسائی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہ درست ہے کہ عام لوگوں کی ہمارے سارے کلاسیکل سرمایے تک رسائی نہیں ہوتی۔ مگر ہو تو سکتی ہے۔ دیوناگری یا رومن رسم الخط میں تو اس ناپید اکنار سمندر کے چند قطرے ہی مل سکیں گے اور ہر دریا کو کوزے میں بند کیا بھی نہیں جاسکتا۔ ترکی میں اتاترک نے رومن رسم الخط رائج تو کر دیا مگر ترک اس جھٹکے سے ابھی جانبر نہیں ہو سکے ہیں۔ ہمارے یہاں تو سارے سرمایے کے منتقل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فراق نے ایک دفعہ اپنی کتابوں کی الماری میں کتابوں کی قطار کی طرف اشارہ کرکے بڑے مزے کی بات کہی تھی:

I DO NOT READ THEM, I NEED THEM

میں انھیں پڑھتا نہیں ہوں مگر ان سب کی مجھے ضرورت رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اردو کی سب کتابیں کون پڑھ سکتا ہے مگر ان سب کتابوں کی ضرورت سبھی کو ہے اور کچھ بقدر شوق

باقی صفحہ ۱۲ پر

محمد انصار اللہ

دیوانِ غالب کے بھوپالی نسخے

دیوان غالب کا پہلا بھوپالی نسخہ (نوشتہ ۱۲۳۷ھ) غالبیات میں ایک بے مثل اضافے کا حکم رکھتا تھا اس پر کچھ اصلاحات مندرج تھیں جن کی بابت اس کے فاضل مرتب نے اس طرح خیال آرائی کی تھی۔

"اگرچہ اصلاحوں کا خط بہت خراب اور شکستہ ہے لیکن پھر بھی اس میں اور غالب کے طرز تحریر کے موجودہ نمونوں میں ایک گونہ مشابہت پائی جاتی ہے۔" (تمہید)

دو چیزوں میں مشابہت کا پایا جانا تحقیق کے کسی بھی اصول کے مطابق ان کے ایک ہونے کی لازمی اور قطعی دلیل نہیں ہو سکتی، دو مختلف افراد کا خط ایک دوسرے کے ساتھ اس حد تک مماثل ہو سکتا ہے کہ ایک پر دوسرے کا دھوکا ہو، اس امکان پر نگاہ نہیں کی گئی۔ پھر اصلاحوں کے خط اور غالب کے خط میں مذکورہ "ایک گونہ مشابہت" بھی ہر جگہ نہیں تھی چنانچہ امتیاز علی خاں صاحب عرشی نے اس کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے:

"حک و اضافے کا خط جگہ جگہ میرزا صاحب کے اس خط سے ملتا ہوا ہے جس سے ہم آشنا ہیں لیکن بعض مقامات پر وہ بالیقین میرزا صاحب کا نہیں معلوم ہوتا جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انھوں نے مرخوشی یا کسی دوسری وجہ سے کسی اور سے بھی یہ کام لیا ہے۔" (نسخۂ عرشی ص۷۶)

یہ بات بعید از امکان نہیں ہے کہ ایک مخطوطے پر اس کے کاتب کے سوا کوئی اور شخص اصلاح کرے، یہ بات بھی ناممکن نہیں کہ اصلاح کرنے والے ایک سے زائد لوگ ہوں لیکن محض قیاسات کے سہارے کسی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش بہت صحیح نہیں ہوتی۔ مرتب نسخۂ حمیدیہ (مبنی بر نسخۂ بھوپال اول) کے نزدیک تمام اصلاحیں ایک ہی شخص کے قلم کی ہیں، یہ شخص کاتب کے سوا کوئی اور ہے یہ محض ان کا قیاس ہے اور اس کے لیے کوئی قطعی ثبوت موجود نہیں، اس شخص کا خط غالب کے مسلّم انداز تحریر سے مختلف ہے، بعض مقامات پر فرق زیادہ واضح تھا ان کے لیے بعد کے راوی نے یہ تاویل پیش کر دی کہ یہ اصلاحیں کسی دوسرے کے خط میں ہیں لیکن کی گئی ہیں مصحح اول ہی کی ایما سے اس تاویل کے لیے بھی پہلے مفروضے کی طرح کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا۔ یہ خیال کہ مصحح اول غالب ہی تھا بجائے خود محض بر بنائے قیاس ہے اور یہ ساری قیاس آرائی اس بنا پر ہے کہ:

"حواشی میں جو اشعار ہیں وہ بے شبہ غالب کے ہیں اور اصلاحوں کے ذمہ دار بھی وہی ہیں۔" (معاصر حصہ ۲ ص۱۲)

لیکن اصلاحوں کے لیے ذمہ دار کوئی بھی ہو یہ کس طرح ثابت ہوتا ہے کہ اصلاحیں اس "ذمہ دار" کے خط میں بھی ہیں۔ قاضی عبدالودود صاحب نے اس بابت جو لکھا ہے یہ ہے کہ

"لیکن کاتب کون ہے اس کے متعلق فیصلہ کن بات نسخہ کو دیکھے بغیر نہیں کہی جا سکتی۔" (ایضاً ص۱۳)

یعنی قاضی صاحب کے نزدیک اس کا امکان بھی تھا کہ کاتب اس "ذمہ دار" کے سوا بھی کوئی شخص ہو سکتا ہے۔ پروفیسر گیان چند نے ایک دوسرے نسخے پر مندرج اصلاحوں سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے۔

حسن الاکرام

غزل

زخمِ چشم و دل لیے اہلِ نظر جاگا کیے
شمع ساں تنہائے غم میں تا سحر جاگا کیے

عشق نے بدلی نہ اپنی فطرتِ شب زندہ دار
تجھ کو پا کر بھی ترے آشفتہ سر جاگا کیے

آگہی کے درد کا کس سے مداوا ہو سکا
طعنہ زن تھا نیند کا جادو مگر جاگا کیے

چٹکیاں لیتے رہے خواب کے افسوں ہمیں
سونے والے بھی باندازِ دگر جاگا کیے

اک تصور نے جگایا کتنی راتوں کو پہاڑ
اک تمنا لے کے کتنے بام و در جاگا کیے

آنسوؤں کے ہار پہناتے رہے لمحات کو
شام سے ہم تا سحر، با چشمِ تر جاگا کیے

آرزوؤ! تم نے یہ کیسا بنایا ہے محل
پاسباں سوتے رہے دیوار و در جاگا کیے

جھلملا کر بجھ گیا بزمِ طلب کا ہر چراغ
ہم جلا کر شمعِ دل کی رات بھر جاگا کیے

زندگی کی رات خوابوں میں گزرتے کس طرح
انتظارِ صبح میں اہلِ نظر جاگا کیے

کہکشاں کی راہ سے گزرا نہ کوئی قافلہ
تا ابد حسرت کسی کے دیدہ ور جاگا کیے

"کسی شخص نے (غالب کی نوجوانی کے کلام کی نقل اپنے پاس محفوظ کرلی) کچھ عرصے بعد اسے معلوم ہوا کہ غالب نے اپنے کلام میں کہیں کہیں اصلاح کی ہے اور کچھ غزلوں کو قلمزد کر دیا ہے، اس شخص نے یا اس کے کسی مقرب نے غالب کا ذاتی نسخہ لے کر اپنے مخطوطے میں مصرعوں کو کاٹ کاٹ کر اصلاحیں کر دیں۔ کچھ غزلیں قلمزد کر دیں۔"

(ہماری زبان ۸ دسمبر ۱۹۷۰ء)

یہ امکان بھی ہے کہ کاتب سے لکھتے وقت ہی سہو ہوا ہو اور اس نے بعض مقامات پر قلمزد کرکے اپنی تحریر کی تصحیح کی ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ کتابت کے کام سے فرصت پانے کے بعد نظرِ ثانی میں اصلاح کی ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کاتب کو بعد میں کوئی اور نسخہ (لازم نہیں کہ وہ بخطِ مصنف ہی ہو) دستیاب ہو گیا ہو اور اس نے اس کی مدد سے کچھ اصلاحیں کرلی ہوں۔ اس امکان سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا کہ نسخہ کسی دوسرے شخص کے ہاتھ لگا ہو اور اس دوسرے شخص نے اشعار کو کسی اور طرح کسی شخص سے (وہ شاعر کے سوا بھی ہو سکتا ہے) سنا ہو اور اسی پر اعتماد کرکے اس نے یہ تصحیح کرلی ہو، اشعار کے سلسلے میں جو معاملات پیش آتے ہیں ان کا اندازہ مولانا محمد حسین آزاد کے درج ذیل بیان سے بھی کیا جا سکتا ہے۔

"صدہا شعر ہیں کہ لوگوں کے پاس کچھ لکھے ہیں
دیوان مروجہ میں کچھ چھپے اور ان کی زبان سے
کبھی کچھ سنے کبھی کچھ سنے" (دیوان ذوق صـ)

ان تمام امکانات کو پیشِ نظر رکھیں تو معلوم ہوگا کہ نسخے کی کتابت سے اصلاح تک لازم نہیں کہ کسی ایک مقام پر بھی خود شاعر کی ذات کو دخل ہو ایسی صورت میں ڈاکٹر ابو محمد سحر کا یہ خیال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ:

"اتنا تو تقریباً یقینی ہے کہ اس پر کتابخانہ فوجدار محمد خاں کا اندراج اور ان کی ۱۲۶۱ھ کی مہر کی آرائش انھیں (پیر معین الدین) کی رہینِ منت تھی کیونکہ اس کتب خانے کی اکثر موجود کتابوں پر اس عمل میں ان کا ہاتھ صاف پہچانا جاتا ہے اور کچھ عجب نہیں کہ نسخہ بھوپال کے حاشیوں پر شکستہ خط کے بعض اضافے جو تربیت یافتہ خطِ شکستہ کے آئینہ دار ہیں اور جن پر غالب کے خط کا دھوکا ہو چکا ہے انھیں کی سرسری جنبشِ قلم کا نتیجہ ہوں۔" (نیا دور، اگست ۱۹۷۰ء)

اور تاوقتیکہ کوئی داخلی یا خارجی سند نہ پیش کردی جائے اس نسخے کو "غالب کا اپنا" تسلیم نہیں کیا جا سکتا، بلکہ یہ بات بھی قابلِ قبول نہیں ٹھہرتی کہ یہ نسخہ کبھی غالب کی نظر سے گزرا بھی تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر سحر کا یہ خیال صحیح ہے کہ:

"جب ہمارے سامنے اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ یہ مخطوطہ غالب نے فوجدار محمد خاں کو نذر کیا تھا تو اس کی توثیق تو اور بھی محال ہے کہ یہ نواب فوجدار محمد خاں کے لئے تیار کیا گیا تھا یا انھوں نے خود اپنا کاتب بھیج کر اسے نقل کرایا تھا۔"

(نیا دور اگست ۱۹۷۰ء)

اگر بغیر کسی داخلی یا خارجی شہادت کے دیوانِ غالب کے ایک نسخے کو غالب کا اپنا تسلیم کیا جا سکتا ہے تو کسی ایسے نسخے کو بخطِ غالب مان لینے میں کسی تامل کی ضرورت کیوں پیش آتی جس پر ناقص ہی سہی بہرحال ایک ترقیمہ تو موجود ہے جو اسے غالب سے متعلق ثابت کرتا ہے، رہی اندازِ خط کی مماثلت تو اس کا حال ظاہر ہے کہ ان تحریروں کو بھی جو بالیقین میرزا صاحب کی نہیں معلوم ہوتیں، ایک بزرگ نے جو اس مخطوطے کو مرتب کرکے شائع کر رہے تھے محض "یک گونہ مشابہت" دیکھ کر بخطِ غالب تسلیم کر ہی لیا تھا۔ بالکل اسی طرح اگر کسی متعلق کو محض "مماثلت" کی بنیاد پر پورے مخطوطے کے بخطِ غالب ہونے پر "اصرار" ہو تو اس میں نہ حیرت کی کوئی وجہ ہے اور نہ اس سے زیادہ متاثر ہونے کی ضرورت کسی بھی علمی مسئلہ کو وہ اہلِ علم بخوبی طے کر سکتے ہیں جو اس علم سے واقف اور متعلق ہیں۔

دیوانِ غالب کے پہلے بھوپالی نسخے کی تاریخِ کتابت صفر ۱۲۳۱ھ بتائی گئی ہے۔ کاتب بالیقین غالب کے سوا کوئی شخص ہے۔ کتابت کا آغاز بغیر کسی شک و شبہ کے صفر ۱۲۳۱ھ سے پہلے ہوا ہوگا کاتب کے سامنے جو مسودہ رہا ہوگا (مرتب یا غیر مرتب) یقینی طور پر اور پہلے کا ہوگا اور اس مخطوطے میں مندرج کلامِ غالب کے زمانۂ تصنیف کا تعین کرنے کے لئے مسودہ مذکور کے زمانۂ کتابت ہی کی اہمیت ہے مخطوطے کی تاریخِ کتابت پر اس بارے میں اعتماد کرنا صحیح نتائج تک پہنچنے کے لئے غیر مفید ہوگا۔ مسودہ مذکور کس زمانہ کا ہو سکتا ہے اس کا اندازہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ خود غالب نے اپنے حال میں لکھا ہے:

"ابتدائے فکرِ سخن میں بیدلؔ، اسیرؔ اور شوکتؔ کی طرز پر ریختہ لکھتا تھا، چنانچہ ایک غزل کا مقطع تھا:
طرزِ بیدلؔ میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے
پندرہ برس کی عمر سے ۲۵ برس کی عمر تک مضامینِ خیال

---

[1] پیر معین الدین کے حالات کی دریافت اس نسخے کے سلسلہ میں اہم ہوگی، اگر یہ ثابت ہو سکے کہ پیر معین الدین اور حافظ معین الدین ایک ہی شخص تھے تو اس کے دور رس نتائج ہوں گے۔

لکھا گیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہوگیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا۔ اوراق یک قلم چاک کیے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوان میں رہنے دئے۔"

تاحال غالب کے اس قول کی تردید نہیں کی گئی ہے۔ اس کی بنیاد پر جو نتائج مرتب ہوتے ہیں یہ ہیں کہ:

(۱) غالب نے ۱۵ برس کی عمر (۱۲۲۷ھ) میں بیدل کی تقلید شروع کی۔ اس کے بعد کسی زمانے میں اسیر اور شوکت کے طرز کی اتباع بھی کی لیکن بیدل کی تقلید کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اسیر و شوکت کی تقلید شروع کرنے کا زمانہ قیاساً کم و بیش پانچ سال بعد (۱۲۳۲ھ) کا ہو سکتا ہے۔ غالب نے اپنے خط میں تینوں شعرا کا ذکر جس ترتیب سے کیا ہے اس کے پیش نظر بیدل کی اولیت ظاہر ہے۔

(۲) غالب نے پچیس سال کی عمر سے پہلے نہ ترتیب دیوان کا ذکر کیا ہے اور نہ کلام کا انتخاب کرنے کا کوئی تذکرہ ملتا ہے۔ یہ سمجھا جانا چاہیے کہ "اوراق یک قلم چاک" کرنے کے وقت مرتب یا غیر مرتب حالت میں ان کے پاس ان کا کل کلام موجود تھا۔

(۳) پچیس سال کی عمر تک انھوں نے جو کلام جمع کیا تھا اسی کو وہ "بڑا دیوان" کہتے ہیں اور اس بڑے دیوان میں (الف) ایسا کلام شامل تھا جس میں بیدل کی طرح اسیر و شوکت کا ذکر بھی ہوگا اور (ب) وہ مقطع بھی ہوگا جو اقتباس بالا میں نقل ہوا۔

ایسا کوئی مجموعہ جس میں نہ وہ مقطع ہو اور نہ اسیر و شوکت کا نام آئے اسی زمانے کا ہوگا جب غالب نے ان دونوں شاعروں کی تقلید شروع نہیں کی تھی۔ دیوان غالب کے پہلے مخطوطے پر تبصرہ کرتے ہوئے قاضی عبدالودود صاحب نے حسب ذیل امور "توجہ طلب" بتائے ہیں:

۱۔ "بیدل کا ذکر ...... بہت جگہ ہے لیکن اسیر و شوکت کا نام تک نہیں آیا۔ اس میں ایسے اشعار بھی ہیں جو ان شاعروں کے مخصوص رنگ میں ہیں"

اگر ان اشعار کی نشاندہی کردی جاتی تو یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ یہ اشعار کس زمانے میں کہے گئے ہوں گے اور اس طرح زیر بحث نسخہ ہی نہیں خود غالب کی شاعری کے ارتقا کے سلسلے میں بعض مفید امور معلوم ہونے کا امکان تھا۔

۲۔ "غالب رجب ۱۲۳۷ھ میں پچیس برس کے ہوگئے تھے اور ان کا ایک دیوان جس کی کتابت اسی سال کے اوائل میں ہوئی تھی (پہلے بھوپال نسخے سے مراد ہے) چند سال قبل تک موجود تھا۔ ...... یہ دیوان بہت بڑا کیا معنی، بڑا بھی نہیں۔"

عرض کیا جا چکا کہ دیوان مذکور جس بنیادی مسودے کی مدد سے تیار ہوا تھا وہ ۱۲۳۷ھ کے آغاز سے کافی پہلے (ممکن ہے چند سال) تک کے کلام پر مشتمل تھا ظاہر ہے کہ وہ غالب کا بیان کردہ "بڑا دیوان" نہیں تھا۔

۳۔ "غالب نے خود زیر بحث میں انتخاب نہیں، دیوان کے باستثنائے چند اشعار، یک قلم ضائع کر دینے کا ذکر کیا ہے ......"

یعنی یہ کہ سنہ مذکور (۱۲۳۷ھ) سے قبل کے مسودہ کو "انتخاب" قرار دینا خلاف واقعہ بات ہوگی۔

۴۔ "مرتب کا قول ہے، مروجہ دیوان میں جتنی کی جتنی غزلیں ہیں وہ سب اس میں مکمل موجود ہیں۔ ...... جن کی بابت قیاسی طور پر کہا جاتا تھا کہ غالب کے ہیں وہ بھی سب کے سب اس میں پائے جاتے ہیں' (تمہید) بہت سی کٹی پھٹی غزلیں بے شبہ مکمل موجود ہیں لیکن ایسی متعدد غزلوں کا ایک شعر بھی نہیں ......"

۵۔ "میرا خیال ہے کہ (عرض و حاشیہ میں) ۵ صفر ۳۸ھ کے قبل کا بھی کل کلام نہیں مثلاً وہ غزل جس کا مقطع غالب کے خط میں ہے اور جو یقیناً ہے کہ تاریخ مذکور سے پیشتر کی ہے، اس کے بعد کے کل کلام کے تو اس میں ہونے کا سوال ہی نہیں۔"

۶۔ "اضافات و اصلاحات کے متعلق مرتب ...... کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کے سب ۵ صفر ۳۸ھ کے بعد کے ہیں مگر اس کا امکان ہے کہ کچھ اس سے قبل کے ہوں۔"

(دیوان غالب کے دو نسخے، معاصر حصہ ۱۲، [illegible])

دیوان غالب کے زیر بحث نسخے میں ایسی غزلیں موجود ہیں جن کے مقطع میں غالب تخلص نظم ہوا ہے۔ اگر یہ صحیح طور پر متعین کیا جا سکے کہ مرزا نے اسد تخلص ترک کرکے غالب تخلص کب اختیار کیا تو ان غزلوں کے زمانے[۱] کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔ اس کا امکان ہے کہ یہ غزلیں کاتب نسخہ نے اپنے طور پر فراہم کرکے داخل دیوان کی ہوں اس طور پر کتابوں میں اضافے کی مثالیں نایاب نہیں ہیں۔

---

[۱] آفاق احمد صاحب نے فرمایا ہے کہ اس امکان پر بھی غور کر لیا جائے کہ شاید کاتب نے سہواً ۱۲۳۷ھ کو ۱۲۲۷ھ لکھ دیا ہو۔ سہو کتابت کی گنجائش تو بہرحال ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس کے لیے ثبوت درکار ہے بہرحال ان بحثوں میں اس امکان پر اگر نگاہ رہے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

اس لئے اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ دیوان غالب کے پہلے بھوپالی نسخے میں اسیر و شوکت کے نام نہ آنے کی توجیہ اس کے سوا معلوم نہیں ہوتی۔ اگر یہ توجیہ صحیح ہے تو پھر اس کے "بنیادی مسودہ" سے قدیم تر کسی اور ترتیب کے (اگر وہ مرتب دیوان فرض کیا جائے) وجود میں آنے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔

دیوان غالب کے دوسرے بھوپالی نسخے کے متعلق یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ یہ بہ لحاظ زمانہ پہلے نسخے سے "اقدم" ہے۔ لیکن اس کی ترتیب اور پھر کتابت کا زمانہ ہنوز دریافت طلب ہے۔ عرشی صاحب نے اسے "اقدم" ثابت کرتے ہوئے جو بحث کی ہے اس میں فرمایا ہے۔

> "غزلوں میں سے ...... کچھ پر خط تنسیخ کھینچ دیا گیا ہے جو اس کی علامت ہے کہ اس سے جو نسخہ نقل کیا جائے اس میں یہ غزلیں شامل نہ ہوں مگر ایک قلم زد غزل آئندہ نقل ہوئی ہے...... نو دریافت نسخہ از روے زمانہ نسخہ حمیدیہ سے مقدم ہے اس دعوے کا مزید ثبوت یہ ہے کہ جو غزلیں نسخہ مذکور اور نسخہ حمیدیہ میں مشترک ہیں ان میں مختلف شعروں کا متن زیر بحث نسخے میں پہلے اور تھا بعد میں میرزا صاحب نے ترمیم کر دی حمیدیہ میں وہ شعر ان ترمیم شدہ الفاظ کے ساتھ لکھے گئے۔" (آجکل جولائی ۱۹۶۹ء)

خیال یہ ہے کہ اس نسخے سے جو نقل تیار کی گئی اس پر پہلا بھوپالی نسخہ مبنی ہے لیکن اس خیال کو قبول کرنے میں مختلف قباحتیں ہیں۔

۱۔ اگر یہ نسخہ درمیانی ترتیب کے واسطے سے پہلے نسخہ کی بنیاد ہو تو ان دو ترتیبوں کے لئے جو کم سے کم مدت درکار ہے اس کا امکان تقریباً نہیں ہے۔

۲۔ جو غزلیں اس دوسرے نسخے میں مندرج ہیں، اور ان پر خط تنسیخ نہیں کھینچی وہ درمیانی نسخے کے واسطے سے پہلے نسخے میں مندرج ہونی چاہئیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان کو مسترد کر دیا گیا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ پچیس سال کی عمر سے پہلے غالب کم از کم دو مرتبہ اور بھی اپنے کلام کا انتخاب کر چکے تھے، یہ بات غالب کے قول سے ثابت نہیں ہوتی۔

۳۔ بتایا گیا ہے کہ ایک غزل ایسی ہے جو اس دوسرے نسخے میں "قلم زد" کر دی گئی ہے یعنی وہ درمیانی ترتیب میں شامل نہیں ہوئی، پھر وہ پہلے بھوپالی نسخے میں کس طرح شامل ہوگئی؟

ان حقائق کی روشنی میں دونوں بھوپالی نسخوں کے موجود ہونے کی توجیہ ظاہراً یہ ہوگی کہ غالب نے کم و بیش بیس سال کی عمر میں (جب اسیر و شوکت کا اتباع انھوں نے شروع نہیں کیا تھا) اپنا کلام کسی بیاض میں لکھا ہوگا، یہ مسودہ یا اس کی کوئی نقل حافظ معین الدین کو دستیاب ہوئی انھوں نے اس کلام کو اور اس کے علاوہ غالب کا جو کلام انھیں دستیاب ہوا یکجا کر کے دیوان غالب مرتب کیا اور وہی پہلا بھوپالی نسخہ ہوا۔ دوسرے نسخے کے کاتب نے بھی اپنے مقام پر یہی عمل کیا اور دوسرا بھوپالی نسخہ وجود میں آیا۔ دونوں کاتبوں کے وسائل مختلف تھے۔ ایک کو کچھ غزلیں دستیاب ہوئیں دوسرے کو کچھ اور اس طرح کچھ مشترک کلام کے علاوہ دونوں میں مرزا کی کچھ غزلیں تمام و کمال اور کچھ متفرق اشعار ایسے ہیں جو ایک میں موجود ہیں اور دوسرے میں غیر موجود۔ دونوں نسخوں کے کاتبوں نے چونکہ کلام غالب کی فراہمی میں کوشش کی تھی اس کی تصحیح اور نظر ثانی بھی محنت کے ساتھ کی۔ پروفیسر گیان چند نے اس گتھی کو سلجھانے میں بڑی دقت اٹھائی اور نہایت محنت سے مثالیں تلاش کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

> "غالب اپنے کلام میں باربار اصلاح کیا کرتے تھے۔ ایک متن کو کاٹ کر دوسرا متن لکھ دیتے تھے اور کچھ عرصے کے بعد پہلے متن پر واپس آجاتے تھے۔ ...... میری ناقص رائے میں مذکورہ چند اصلاحوں کی یہی تاویل کی جانی چاہیے۔ نئے نسخے کا متن یقیناً نسخہ بھوپال سے اولیٰ ہے"
>
> (ہماری زبان ۸ر دسمبر ۱۹۷۰ء)

اگر پروفیسر صاحب کے اس بیان کو من و عن مان لیا جائے تو کسی بھی متن کے لئے یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ "اولیٰ" ہے عین ممکن ہے کہ جسے ہم اولیٰ سمجھ رہے ہیں یہ بعد والا ہو اور جسے بعد والا خیال کر رہے ہیں وہ جس پر غالب بقول پروفیسر موصوف کے "واپس" آگئے ہوں۔ اس تاویل کے بعد تو بات اور الجھ کر رہ جاتی ہے اور مسئلہ کے حل کی جو ایک ممکن توجیہ تھی اس کی گنجائش بھی نہیں رہ جاتی۔

اگرچہ فی الوقت یہ مسئلہ زیر بحث نہیں ہے مختصراً یہ بات بھی عرض کر دوں کہ وہ ایک غزل جس کی بابت میں نے عرض کیا ہے کہ میر امانی اسد کی ہے دوسرے بھوپالی نسخے کے نہ صرف متن میں ہے بلکہ اس پر "خط تنسیخ" بھی نہیں کھینچا گیا یعنی عرشی صاحب کی توجیہ کے مطابق یہ ان غزلوں میں سے نہیں ہے جو قلم زد کر دی گئیں اور جو آئندہ دیوان میں "شامل نہ ہوں"۔ یہ غزل پہلے بھوپالی نسخے میں نہیں ہے۔ اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ غالب نے اس غزل کو مسترد کر دیا تھا تو اس کے لئے ثبوت بھی

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

مراسلات

دکنی اور اردو

"دکنی کی ابتدا (تحقیق کی نظر میں)" کے عنوان سے ایک کتابچہ ڈاکٹر آمنہ خاتون صدر شعبۂ اردو و فارسی' مہارانی کالج، بنگلور کا جون ۱۹۷۰ء میں ہمدرد پریس' عمر شریف روڈ، بنگلور ۲ سے شائع ہوا ہے۔ مختلف پرچوں میں اس کتابچے پر بڑے تابناک تبصرے بھی ہوئے ہیں۔ بظاہر یہ کتابچہ اردو تحقیق کی دنیا میں ایک دھماکہ ہے جس نے بعض مسلمہ و مروجہ لسانیاتی نظریات کو پاش پاش کر دیا ہے موصوفہ نے بزعم خویش بیک جنبش قلم اردو تحقیق کے جملہ قدیم و جدید ستونوں کو گرا دیا ہے مثلاً بابائے اردو مولوی عبد الحق' حکیم سید شمس اللہ قادری، مولانا سید سلیمان ندوی' پروفیسر حامد حسن قادری' پروفیسر حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے بعض نظریات کی تردید بڑے ادب و احترام کے ساتھ کی ہے۔ یہ پورا کتابچہ اقتباسات مبہم کا ایک محیط ناپیدا کنار ہے جس کے مطالعے سے گاگر میں ساگر اور کوزے میں دریا کا مفہوم تو آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے مگر بعض مقامات پر یہ سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے کہ فلاں قول مصنفہ کا ہے یا کسی اقتباس کا حصہ؟ ۵۵ صفحے کے اس کتابچے کا حاصل یہ ہے کہ:-

> "زبان دہلوی یا اردو یا کھڑی بولی اور دکنی جدید ہند آریائی زبانوں میں داخل ہیں اور دو علیحدہ علیحدہ زبانیں ہیں۔" (ص ۵۵)

ڈاکٹر آمنہ خاتون کے کتابچے کے علاوہ اس وقت میرے پیش نظر دو پاکستانی مطبوعات بھی ہیں جو پروفیسر محمد حیات خاں سیال، صدر شعبۂ اردو' گورنمنٹ کالج جھنگ نے ۱۹۶۸ء میں از راہ کرم ارسال فرمائی تھیں۔ ایک ہے "۱۔ ق۔ ل ذلقد وجہی" مرتبہ پروفیسر محمد حیات خاں سیال مطبوعہ دسمبر ۱۹۶۷ء اور دوسری "سب رس پر ایک نظر" از ڈاکٹر سہیل بخاری مطبوعہ مئی ۱۹۶۷ء۔ ان کے سرسری مطالعے سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ "دو زبانوں کا نظریہ" ڈاکٹر سہیل بخاری' پی۔ اے۔ ایف کالج' سرگودھا (مغربی پاکستان) ڈاکٹر آمنہ خاتون سے کئی سال پہلے پیش کر چکے ہیں۔ موصوف نے بھی دکنی اور اردو کو دو الگ الگ زبانیں قرار دیا ہے اور "اردو نامہ" کراچی شمارہ ۳۸ میں "قدیم دکنی اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ" کے عنوان سے ایک مقالے میں اس نظریے کی بڑی شد و مد سے حمایت کی ہے۔

ڈاکٹر بخاری نے اپنے نظریے کے ثبوت میں مولوی محمد باقر آگاہ ویلوری کے رسالہ "من درپن" (معجزات نبی کریم' تصنیف ۱۲۰۴ھ) کا یہ شعر پیش کیا ہے ؎

> اگر بھاکے میں اردو کے میں کہتا
> کوئی اس کو یہاں کے لوگاں میں پہچاتا

اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:-

> "آگاہ نے اسے (من درپن) آسان دکھنی زبان میں لکھا ہے جسے وہ اردو نہیں کہتے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کے خیال میں دکھنی و اردو دو جدا جدا زبانیں ہیں۔"
>
> (ماہنامہ "قومی زبان" کراچی جنوری ۱۹۷۲ء)

لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ڈاکٹر آمنہ خاتون نے اپنے کتابچے میں ڈاکٹر سہیل بخاری کا کہیں ذکر تک نہیں کیا ہے۔ گویا موصوفہ ہی بلا شرکت غیرے اس نظریے کی خالق ہیں' یہ بھی یقین نہیں آتا کہ ڈاکٹر آمنہ خاتون' ڈاکٹر بخاری کے نظریے سے بے خبر تھیں' ڈاکٹر بخاری کا نظریہ ضرور ان کی نظر سے گزرا ہوگا، تو پھر انھوں نے ڈاکٹر بخاری کا حوالہ کیوں نہیں دیا؟ اور اگر یہ سمجھا جائے کہ موصوفہ واقعی اس نظریے سے بے خبر تھیں تو پھر کیا اسے "تحقیق تو ارد" سمجھا جائے۔

دہلی۔ • جاوید وششٹ

تبرکات غالب واسد

پروفیسر عبد القوی دسنوی صاحب نے محولہ بالا عنوان کے تحت "ہماری زبان" کے ۸ رجنوری ۱۹۷۱ء کے شمارے میں "مجمع الاشعار" سے غالب سے منسوب دو غزلیں نقل کی ہیں' جن کے مطلعے یہ ہیں:

(۱)

> کب رہا ہے اب ہمیں درد بشر کا امتیاز
> دیکھ کر جاتا رہا مجھ کو نظر کا امتیاز

(۲)

> ہے گا جو ناز و ادا اس بت لاثانی میں
> ایک بھی بات نہ تھی یوسف کنعانی میں

ان غزلوں کو قاضی معراج دھولپوری صاحب بہت پہلے اپنے مضمون "تبرکات غالب" مطبوعہ "ہماری زبان" شمارہ یکم اگست ۱۹۶۱ء میں "چمن بے نظیر" اور "مجمع الاشعار" کے حوالے سے پیش کر چکے ہیں' قاضی صاحب نے اپنے مضمون میں "چمن بے نظیر" اور "مجمع الاشعار" کے بارے میں بھی پوری معلومات

فراہم کردی ہیں۔

"چمن بے نظیر" سنہ ۱۲۷۶ھ کی تالیف ہے اور "لالۂ زار نظم" مادہ تاریخ ہجری۔ محمد ابراہیم بن شہاب الدین موسیٰ اس کے مولف ہیں اور یہ ۱۲۷۵ھ (۱۸۵۸ء–۵۹ء) میں پہلی بار بمبئی میں چھپا۔ اب تک اس کے متعدد اڈیشن نکل چکے ہیں۔ قاضی صاحب کے پیش نظر نولکشوری ۱۸۸۲ء اور مجیدی ۱۳۴۴ھ تھے۔

"مجمع الاشعار" محمد حسین آزاد کی تالیف کردہ ہے۔ یہ پہلی بار ۱۲۶۶ھ (۱۸۴۹ء–۵۰ء) میں بمبئی میں چھپا۔ اس کے بھی متعدد اڈیشن نکل چکے ہیں۔ قاضی صاحب کے پیش نظر مطبع جوالا پرکاش میرٹھ ۱۳۰۸ھ (مطابق ۱۸۹۱ء)، نولکشور پریس ۱۸۸۶ء اور مجیدی ۱۳۴۳ھ کے اڈیشن تھے۔

راقم السطور کے پیش نظر "چمن بے نظیر" کا نولکشور پریس کا دسواں اڈیشن (نومبر ۱۹۲۷ء) اور "مجمع الاشعار" کا فخر المطابع لکھنؤ (شعبان ۱۳۲۳ھ) کا اڈیشن ہے۔ ان دونوں مجموعوں کے تقابلی مطالعے سے چند دلچسپ حقائق سامنے آتے ہیں:۔

(۱) محمد ابراہیم مولف "چمن بے نظیر" اور محمد حسین مولف "مجمع الاشعار" میں ذاتی مراسم تھے جیسا کہ "چمن بے نظیر" کے خاتمے کی درج ذیل عبارت سے ظاہر ہے:۔

"۔۔۔۔۔۔ مدون و مولف اس کے سخن دان شیریں زبان محمد ابراہیم صاحب بن شہاب الدین موسیٰ ہیں جنھوں نے بفرط شوق و مزید لیاقت باتفاق رائے محمد حسین صاحب اس مجموعہ کو بطرز شائستہ فراہم کیا۔۔۔۔۔۔" !

(۲) "چمن بے نظیر" کے بعد کے اڈیشنوں پر بھی مولف کا نام برقرار ہے، جب کہ "مجمع الاشعار" کے بعد کے اڈیشنوں سے مولف کا نام غائب ہوگیا ہے!

(۳) "مجمع الاشعار" کا ایک اہم ماخذ "چمن بے نظیر" ہے۔

اس بنا پر یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ غالب سے منسوب محولہ بالا دونوں غزلیں پہلے "چمن بے نظیر" میں شائع ہوئیں اور بعد میں "مجمع الاشعار" کے مولف نے وہیں سے نقل کرلیں۔ ان دونوں غزلوں میں سے پہلی غزل کے بارے میں حتمی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ مرزا غالب کی نہیں، بیگم زائن جہاں نے اپنے تذکرہ "دیوان جہاں" (مرتبہ ۱۸۱۲ء) میں یہ غزل طالب جنگ غالب کے ترجمے میں لکھی ہے۔[۱] دوسری غزل بھی زبان و بیان کے اعتبار سے مرزا غالب کی نہیں معلوم ہوتی۔ قرائن یہ ہیں کہ یہ غزل بھی کسی دوسرے غالب کی ہو۔ جس طرح مولف "گلشن ہمیشہ بہار" نے مرزا کی آسد تخلص والی ایک غزل کو میر امانی اسد کے نام منسوب کردیا، اسی طرح ان مجموعوں کے مولفین نے دوسرے غالب کی غزلوں کو مرزا غالب کے نام منسوب کردیا ہے۔

گورکھپور۔ • احمر لاری

[۱] دیکھئے "دیوان جہاں" مرتبہ کلیم الدین احمد ص ص ۶۹–۱۶۸

صوبہ بہار میں اردو کے ساتھ ناانصافی

یہ مسئلہ بہت زیادہ اہم ہے کہ ریاست بہار میں اردو مکاتب اور اسکولوں کے لیے کسی اردو داں انسپکٹر کی بحالی قطعی نہیں ہے صوبہ بہار کے کونے کونے میں ہزاروں کی تعداد میں اردو اسکول و مکاتب پھیلے ہوئے ہیں جن میں یہ پوچھنے والا بھی کوئی نہیں ہے کہ "صاحب آپ یہاں کیا پڑھا رہے ہیں اور نصاب تعلیم کیا ہے"؟ خبریں ملتی رہتی ہیں کہ اردو پوسٹ اسکولوں میں ہندی جاننے والے ٹیچرس کا تقرر طویل عرصہ سے جاری ہے اور ہمارے پاس ایسی شکایتیں اکثر آتی رہتی ہیں کہ سرے سے اردو اسکول میں اردو پڑھائی جا ہی نہیں رہی ہے۔

اس طرح بتدریج اردو کو عملی طور پر ان اسکولوں سے ہمیشہ کے لیے ختم کردینے کی تدبیریں ہو رہی ہیں۔

خاص طور پر میں خواندہ طبقہ سے اپیل کروں گا کہ وہ اس سلسلے میں اخبارات کے ذریعے حکومت کو چونکاتا رہے کہ کن اسکولوں میں کہاں کہاں اس طرح کی ناانصافیاں ہو رہی ہیں۔ اس طرح کی ایک طویل فہرست تیار کرنے کی ضرورت ہے تاکہ حکومت کو اس طرف متوجہ کیا جاسکے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت ایک مستقل شعبہ اردو انسپکشن کا ریاست گیر پیمانے پر قائم کرے اور اردو انسپکٹر بحال کرے جو یہ دیکھ سکے کہ وہ مکاتب اپنے صحیح خطوط پر کام کر رہے ہیں یا نہیں۔

تاکہ اس قسم کی پیدا ہونے والی تمام شکایات کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوسکے۔

بھاگلپور۔ • شبیر احمد صابری

اخبار و اذکار

روشؔ صدیقی، عابد علی عابد اور احترام الدین کو خراج عقیدت

مورخہ ۲۲ر جنوری ۱۹۷۱ء کو شعبۂ اردو کے سیمنار میں انجمن اردوئے معلّٰی کی جانب سے ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس میں حضرت روشؔ صدیقی۔ عابد علی عابد اور احترام الدین شاغل کی اچانک وفات پر اظہار افسوس کیا گیا۔

پروفیسر آل احمد سرور صاحب نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ ہفتہ ہم پر بہت سخت گزرا ہے جس میں اچانک یکے بعد دیگرے ہم میں سے تین ادبی ہستیاں رخصت ہوگئیں یہ ایسا سانحہ ہے جس کی تلافی ناممکن ہے۔ آپ نے مرحومین کی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ان میں سے ہر شخص اردو شعر و ادب کا مخلص خادم تھا۔ تقریر کے بعد آپ نے الگ الگ تین قرار دادیں پڑھ کر سنائیں۔ متن درج ذیل ہے۔

(۱) انجمن اردوئے معلّٰی شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا یہ جلسہ حضرت روشؔ صدیقی کی ناگہانی وفات پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

روشؔ صدیقی اردو کے ایک بلند پایہ اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ ان کی شاعری کا آغاز رومانی نظموں سے ہوا تھا جن میں پاکیزہ جمال پرستی اور منافرت سے والہانہ لگاؤ ملتا ہے۔ بہت جلد انھوں نے اپنے آپ کو ہندوستان کی قومی و سیاسی جدو جہد سے وابستہ کر لیا اور اس وابستگی کی بدولت ان کی شاعری کو وسعت اور گہرائی نصیب ہوئی۔ وہ ادبی حلقوں میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور مشاعروں میں بھی مقبول اور ہر دلعزیز رہے۔ حضرت روشؔ کی وفات سے اردو زبان و ادب کو ایک ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ ہم خداوند کریم سے دست بدعا ہیں کہ مرحوم کی روح کو سکون بخشے اور ان کے متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔

(۲) انجمن اردوئے معلّٰی کا یہ جلسہ اردو زبان کے نامور ادیب، محقق اور ناقد سید عابد علی عابد کی وفات پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ عابد علی عابد کی عمر تقریباً پچھتر سال تھی وہ اردو کے ایک سربرآوردہ ادیب تھے انھوں نے نظم و نثر کی متعدد اصناف میں قابل قدر کارنامے یادگار چھوڑے ہیں، وہ پاکستان کی مجلس ترقی ادب کے عرصے تک سکریٹری رہے اور رسالہ "صحیفہ" کی ادارت کے ذریعہ انھوں نے علمی و تحقیقی ادب کو فروغ دینے میں بیش از بیش حصہ لیا۔ متعدد علمی کتابوں کے ترجمے بھی ان کی یادگار ہیں۔

(۳) انجمن اردوئے معلّٰی کا یہ جلسہ اردو زبان کے ایک دیرینہ خادم اور معروف شاعر حضرت احترام الدین شاغل عثمانی کی وفات پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

حضرت شاغل راجستھان کی انجمن ترقی اردو کے سکریٹری تھے وہ "تذکرہ شعرائے جے پور" اور "صحیفۂ خوش نویسان" کے مصنف تھے اردو زبان کے فروغ و ارتقا کے سلسلے میں انھوں نے شاندار خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی وفات سے اردو تحریک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔

ہم مرحوم کے اعزا و متعلقین کے غم میں شریک ہیں اور ان کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔

• قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی سکریٹری انجمن اردوئے معلّٰی

مولوی احترام الدین احمد شاغل کی وفات پر اظہار غم

عہدہ داران، اراکین اور کارکنان جامعہ اردو علی گڑھ کا یہ خاص جلسہ جناب مولوی احترام الدین احمد عثمانی شاغل مرحوم کے انتقال پر ملال پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

مرحوم عرصہ دراز تک جامعہ اردو کے مجلس منتظمہ کے رکن رہے اور اب کئی سال سے مجلس عاملہ کے بھی ممبر تھے۔ موصوف کے دل میں خدمت اردو کا پر خلوص اور بے پناہ جذبہ تھا جس کی

وجہ سے اپنی نجی و قومی مصروفیات اور آخر میں خرابی صحت کے باوجود جامعہ اردو کے جلسوں میں پابندی کے ساتھ طویل سفر کی زحمت گوارا فرما کر شریک ہوا کرتے تھے اور مفید مشورے دیا کرتے تھے جناب ظہیر الدین علوی صاحب مرحوم کے ساتھ مل کر موصوف نے راجستھان میں فراہمی جامعہ فنڈ کے لئے بہت محنت اور دلچسپی سے کام کیا تھا۔

راجستھان کے مختلف مراکز پر جامعہ اردو کے ۰۰۰ امتحانات کی نگرانی کا انتظام فرماتے تھے اور ان کی ذاتی دلچسپی کی بدولت امتحانات قابل اطمینان طور پر انجام پاتے تھے۔

مرحوم اس کے علاوہ بھی اردو کی بہبودی اور ترقی کے کاموں میں مستعدی اور دلچسپی سے حصہ لیتے تھے۔

مردم شماری کے موقعوں پر خاص طور پر مرحوم کی انتھک کوشش سے راجستھان میں بڑی حد تک مادری زبان کے اندراج میں غلط کاری کا سد باب ہو جاتا تھا۔

موصوف کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ بڑی جدوجہد کے بعد راجستھان گورنمنٹ، راجستھان یونیورسٹی اور راجستھان سکنڈری ایجوکیشن بورڈ سے جامعہ اردو کے امتحانات کو تسلیم کرایا اور اس طرح جامعہ اردو کے سند یافتہ طلبہ کے لئے سرکاری تعلیمی اداروں میں ملازمت اور آئندہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے دروازے کھلوائے۔

ہم سب شرکاء جلسہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔

● جامعہ اردو

روشؔ صدیقی کے سوگ میں تعزیتی جلسہ

ردولی شریف۔ ۲۳ر جنوری ۱۹۷۱ء۔ حضرت روشؔ صدیقی کے اچانک انتقال پر مرکز "ادب اردو" کی جانب سے شاہ عزیز احمد مرحوم کے مکان پر ایک تعزیتی جلسہ ہوا جس میں سید عابد علی عابدؔ اور روشؔ صدیقی کے انتقال پر اظہار غم کیا گیا۔

سید عابد علی عابدؔ کے کام اور کلام پر تقی شبرؔ نے روشنی ڈالی اور روشؔ صدیقی کے فن اور شخصیت پر اقبال ردولوی نے مختصر تقریر کی۔ بعد میں ایک مشاعرہ جناب واصفؔ کی صدارت میں ہوا۔ جس کا آغاز روشؔ صاحب اور عابد علی عابدؔ کی غزلوں سے ہوا۔ مشاعرے میں عمر اختر منظر، کیفؔ، رئیسؔ شاکری، شبیر کاظمی، تقی شبرؔ، اقبال ردولوی، علی رضا رضا عادل، نجمی، محسنؔ، جاوید صدیقی، سیوک، عزمی وغیرہ نے شرکت کی۔

● شاہ حسین احمد درگاہ شریف

قطعات غم

بروفات جناب حضرت روشؔ صدیقی مرحوم

اٹھ گیا آہ! روشؔ ساہل سخن

بزم اردو سیاہ پوش ہوئی

اے قمرؔ لکھ یہ مصرع تاریخ

"آہ شمع ادب خموش ہوئی"

۱۹۷۱ء

● قمر جلالی

دہلی۔

روشؔ، شاغلؔ اور عابدؔ کو ادبی سنگم کا خراج عقیدت

نئی دہلی۔ ۲۸ر جنوری۔ ادبی سنگم جامعہ نگر کی جانب سے ایک تعزیتی جلسہ اسٹاف کلب میں منعقد ہوا جس کی صدارت جامعہ کالج کے شعبۂ اردو کے لیکچرار جناب قیصر زیدی صاحب نے فرمائی۔

اردو کے دو عظیم شعرا حضرت روشؔ صدیقی اور عابد علی عابدؔ صاحب اور اردو کے تذکرہ نویس اور تحریک اردو کے ایک اہم ستون مولانا احترام الدین احمد شاغلؔ صاحب کی وفات پر تعزیتی قرار دادیں منظور ہوئیں۔ تجویز کالج کی شعبۂ انگریزی کی لیکچرار مسز لی رنگا ناتھن نے روشؔ صاحب کا کلام پیش کیا۔ جامعہ اسکول آف سوشل ورک کے شعبۂ انگریزی کے لیکچرار جناب انوار علی خاں سوزؔ صاحب نے مرحوم کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ تعزیتی تجویز میں ادبی سنگم نے روشؔ صاحب کی وفات سے اردو شعر و ادب کو جو نقصان پہنچا ہے اس کو ناقابل تلافی قرار دیا اور حکومت ہند سے اپیل کی کہ وہ مرحوم کی ادبی خدمات کے صلے میں ان کے پسماندگان کو کسی قسم کی پنشن مقرر کرے احترام الدین شاغلؔ کے متعلق قرارداد میں کہا گیا کہ راجستھان میں اردو کا بول بالا آپ ہی کے دم سے تھا۔



عابد علی عابد صاحب کی وفات پر اظہار افسوس کرتے ہوئے بارگاہ ایزدی میں دعا کی گئی کہ وہ مرحوم کی قبر پر انوار کی بارش کرے۔

روشؔ صدیقی کے انتقال پر انجمن ترقی اردو کا اظہار غم

دہلی ۲۵ر جنوری۔ انجمن ترقی اردو دہلی کے صدر پنڈت سندر لال اور سکریٹری جناب بہار برنی نے حضرت روشؔ صدیقی کے سانحہ ارتحال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ بیان میں اس تعلق کا تذکرہ کرتے ہوئے جو انجمن ترقی اردو دہلی کے ساتھ حضرت روشؔ صدیقی کا رہا ہے ان کی وفات کو اردو دنیا کے ساتھ انجمن کا ایک ناقابلِ تلافی نقصان بتایا گیا ہے۔ روشؔ صاحب مرحوم جس قدر بلند مرتبہ شاعر تھے اس سے کہیں زیادہ ایک عظیم اور اور باوضع انسان بھی تھے۔

روشؔ کے انتقال پر تعزیتی جلسے

لکھنؤ۔ ۲۴ر جنوری یہاں ادارہ فروغ اردو ہند کے زیر اہتمام ایک تعزیتی جلسہ زیر صدارت مولانا محمد حسین شمس علوی ہوا۔ جس میں روشؔ صدیقی کے اچانک انتقال پر افسوس کرتے ہوئے مقررین نے اُن کو اردو غزل کا نمائندہ شاعر قرار دیا۔ جلسہ میں اس خیال کا اظہار بھی کیا گیا کہ ان کی وفات سے اردو غزل کے ایک اور گیسو سنوار نے والے کی کمی ہو گئی۔

ایک دوسری تجویز کے ذریعہ اردو کے ایک اور مشہور و منفرد شاعر عابد علی عابد صاحب کے انتقال پر اظہار افسوس کرتے ہوئے اُن کی موت کو اردو کا عظیم نقصان قرار دیا گیا۔

کل ہند، ہندی اردو سنگم کا ایک ہنگامی جلسہ ہوا جس میں روشؔ صدیقی کے سانحہ انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔

حنا بلڈنگ چوک میں ایک تعزیتی جلسہ حاجی اکبر علی خاں صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں حاجی صاحب نے مرحوم روشؔ صدیقی سے حالیہ ملاقات کے تاثرات بیان کیے۔

عشرت مرادآبادی کی پیش کی ہوئی ایک تعزیتی تجویز منظور ہوئی جس میں مرکزی و ریاستی حکومتوں سے مطالبہ کیا کہ مرحوم کے پسماندگان کو وظیفہ جاری کیا جائے۔

بزم خواتین کا ایک تعزیتی جلسہ بیگم معین الدین حسن کی صدارت میں ہوا جس میں بیگم تنویر ضیاء نے روشؔ صدیقی کی موت پر ایک تعزیتی تجویز پڑھی جو حاضرین کی طرف سے منظور کی گئی۔

جشن اسلم کمیٹی لکھنؤ کا ایک تعزیتی جلسہ زیر صدارت جناب سعادت علی صدیقی مولوی گنج میں منعقد ہوا جس میں روشؔ صدیقی کی وفات پر رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔

متعدد مقررین نے مرحوم کے فن اور شخصیت پر روشنی ڈالی۔ مسٹر سلیم عمر نے ایک تعزیتی تجویز پیش کی جو متفقہ طور پر منظور ہوئی۔

انجمن ترقی اردو اجمیر کی تعزیتی قرارداد

اجمیر: انجمن ترقی اردو ضلع اجمیر کا ایک خصوصی جلسہ جس میں رکن شاغل جے پوری اور حضرت روشؔ صدیقی کی وفات پر بغرض دعائے مغفرت و اظہار تعزیت منعقد ہوا۔ حسب ذیل تجاویز منظور کی گئیں۔

تجاویز: ۱۔ انجمن ترقی اردو ضلع اجمیر کا یہ خصوصی جلسہ اردو کے بے باک اور جوان ہمت خادم الحاج مولوی احترام الدین احمد شاغل جے پوری جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو راجستھان کی وفات پر دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور دست بدعا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر ان کی مغفرت فرمائے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

۲۔ آج کا یہ خصوصی جلسہ اردو کے مایہ ناز شاعر حضرت روشؔ صدیقی کی اچانک موت پر افسوس و غم کا اظہار کرتا ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں مقام بخشے اور پسماندگان کو صبر جمیل دے۔

سید عبد الرؤف
صدر

باقی صفحہ ۲ سے آگے

پیش کرنا ہوگا دعویٰ جو بے دلیل ہو جس حد تک قابل قبول ہو سکتا ہے ظاہر ہے۔ یہ دعویٰ کہ خستگی نے میرزمانی سے غلط انتساب کیا خود محتاج ثبوت ہے قیاس اور محض ایسا قیاس جو اپنے مفروضات ہی کے حق میں ہو تحقیق میں قابل قبول نہیں مثبت اور منفی سبھی امکانات پر نظر کی جانی چاہیئے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ میرزمانی کے کم از کم ایک شعر کا اس غزل کے علاوہ غالب سے خود ان کی زندگی میں منسوب ہونا ثابت ہے اور اب تک غالب کے کسی غزل یا شعر کیا معنی ایک مصرع کا بھی میرزمانی سے منسوب ہونا کہیں غلطی سے بھی مذکور نہیں ہوا ہے۔ اس بنا پر میرے نزدیک حقیقت یہی ہے کہ کاتب نسخہ نے جو غالب کے سوا کوئی شخص ہے اور جو گزر اور گزرگاہ میں ڈال، خورشید میں واؤ، طپیدن میں ط لکھتا ہے، غلطی سے میرزمانی کی غزل کو بھی دیوان غالب کے اس مخطوطے میں شامل کر دیا ہے۔

باقی صفحہ ۳ سے آگے

اور حسب استعداد ہر ایک انھیں پڑھ سکتا ہے۔ اس لئے رسم الخط کے سلسلے میں یہ مسئلہ میرے نزدیک بنیادی ہے کہ آدمی زیادہ سے زیادہ کتابوں تک پہنچ سکے۔ گولیوں میں بند غذا (TABLOIDS) سے ہم چاند تک تو پہنچ سکتے ہیں مگر دھرتی پر سیدھے سبھاؤ نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح دیوناگری رسم الخط یا رومن رسم الخط میں اردو کی چند کتابوں یا چند سو کتابوں تک رسائی کے معنی اردو ادب تک رسائی کے نہیں ہیں۔ بقول پوپ کے تھوڑا علم خطرناک ہے۔ خوب سیر ہو کر پیو یا مقدس چشمے کو آلودہ نہ کرو یا آنا تو کرو کہ چشمے کا دعوا نہ کرو۔ اردو کے نئے جو لوگ ناگری رسم الخط اختیار کرنے کی بات کرتے ہیں وہ خدا جانے کیسے اس دھوکے میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ اردو اگر مری نہیں تو نیم جاں ہے اور اس زبان کو بچانے کی صرف ایک ہی صورت رہ گئی ہے کہ دیوناگری رسم الخط کے ذریعے سے یہ ہندی پڑھنے والوں کے دلوں میں پہنچ جائے اور بالآخر رسم الخط کو ترک کرکے کسی طرح اپنی جان بچائے۔ اول تو یہ ایک خطرناک خوش فہمی ہے کہ دیوناگری رسم خط اختیار کرلینے کے بعد اردو کی مقبولیت بڑھ جائے گی، دوسرے میں تو سرے سے یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوں کہ اردو نیم جاں ہے یا مر رہی ہے۔ جن لوگوں کا ایمان ضعیف ہے وہ ذرا ہوا تیز چلے یا آندھی آئے تو نیچے اوپر ہونے لگتے ہیں، اردو پر نہ پہلی بار وقت پڑا ہے نہ اردو کی جان کے لالے پڑے ہیں، نہ اردو سمٹ کر چند شہروں تک رہ گئی ہے، نہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے، نہ اردو جاگیرداروں نوابوں کی یادگار ہے، نہ یہ مصنوعی زبان ہے۔ اردو ہماری مشترک تہذیب کا سب سے شاندار عطیہ ہے۔ یہ ہندوستان کی دھرتی سے اُگی، ہندوستان کے کھیتوں کھلیانوں میں پلی بڑھی، یہاں کے بازاروں خانقاہوں اور درباروں میں بڑھی اور جوان ہوئی اور یہاں کی ہر کروٹ ہر تحریک، ہر کشمکش، ہر درد و داغ، سوز و ساز، آرزو اور جستجو کی امین ہے۔

۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق دو کروڑ اڑتیس لاکھ ہندوستانی یہ زبان بولتے ہیں۔ یہ تعداد بہت سے ملکوں کی آبادی سے بڑی ہے۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری مارچ میں ہونے والی ہے۔ اندازہ ہے کہ اردو بولنے والوں کی تعداد موجودہ حالات کے باوجود اور دقتوں اور دشواریوں کے باوصف تین کروڑ سے زیادہ ہی ہوگی۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اردو بولنے والے کم ہو رہے ہیں۔ اگر ملک کی تقسیم کے وقت کچھ اردو بولنے والے چلے گئے تو ان کی جگہ بہت سے آ بھی گئے۔ ہمارے صنم خانے کو کعبے سے بھی پاسبان ملے ہیں۔ پھر ہندوستان کی کوئی ریاست ایسی نہیں ہے جس میں اردو بولنے والے موجود نہ ہوں۔ اور اترپردیش میں اکہتر لاکھ، بہار میں اکتالیس لاکھ، مہاراشٹر میں ستائیس لاکھ، آندھرا پردیش میں پچیس لاکھ، میسور میں بیس لاکھ، مغربی بنگال میں آٹھ لاکھ، مدھیہ پردیش میں آٹھ لاکھ، تامل ناڈ میں چھ لاکھ، گجرات میں چھ لاکھ، راجستھان میں پانچ لاکھ، اڑیسہ میں دو لاکھ، ہریانے میں دو لاکھ اور دہلی میں ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ آبادی تو ۱۹۶۱ء کی مردم شماری میں دکھائی گئی ہے۔ یہ تعداد برابر بڑھ رہی ہے اور دقتوں دشواریوں کے باوجود بڑھ رہی ہے۔ اس کی تعلیم کا ریاستی حکومتیں مناسب انتظام نہیں کرتیں۔ اس کے چلن پر رکاوٹیں ہیں۔ اس کے خلاف کچھ حلقوں میں تعصب ہے۔ یہ تعصب دور ہو جائے یہ رکاوٹیں نہ رہیں اور اردو کی تعلیم کا مناسب انتظام ہو تو آپ اردو کی ترقی دیکھیے گا۔ اعلیٰ سطح پر اردو کی تعلیم پہلے سے بہت زیادہ بڑھی ہے۔ لگ بھگ چالیس یونیورسٹیوں میں اردو کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہے۔ اردو میں تحقیق اور تنقید دونوں کا معیار پہلے سے بہت بہتر ہے۔ اردو میں اخبار آج بھی انگریزی اور ہندی کے بعد سب سے زیادہ شائع ہوتے ہیں۔ اردو میں ہر سال جو کتابیں نکلتی ہیں ان کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے کم نہیں ہو رہی ہے۔ اردو کشمیر کی سرکاری زبان ہے آندھرا پردیش میں تلنگانہ اور ہماچل پردیش کی ثانوی زبان ہے۔ پنجاب کی ثانوی زبان منوانے کی کوششیں جاری ہیں۔ اترپردیش، بہار، مہاراشٹر، آندھرا، میسور اور دہلی میں اسے سرکاری زبان منوانے کی تحریک اس وقت تک جاری رہے گی جب تک اسے تسلیم نہ کر لیا جائے۔ میں ہندوستانی جمہوریت سے مایوس نہیں ہوں۔ ہندوستانی عوام پر میرا ایمان محکم ہے۔ میں جانتا ہوں کہ انھیں کچھ عرصے تک اور بہکایا جا سکتا ہے مگر بالآخر ان کا ضمیر جاگے گا اور وہ اردو کو اس کا حق دیں گے۔ اردو کسی دوسرے دریا کے معاون کی حیثیت سے نہیں، ایک آزاد، خود مختار، اپنی ایک انفرادیت رکھنے والے، اپنی روش پہ بہنے والے، اپنی موجوں کے زیر و بم سے ہزاروں آئینے دکھلانے والے دریا کی حیثیت سے اپنا فیض عام کرتی رہے گی۔ اپنے سے مایوس، دوسروں پر تکیہ کرنے والے سیاست کے شکار یا تجارت کے غلام اردو سے مایوس ہوں تو ہوں، ہندوستان کے کروڑوں عوام جن کی زندگی، جن کا وجود، جن کی شخصیت، جن کا کردار، جن کا مزاج اردو سے بنا ہے، وہ نہ اپنے سے مایوس ہیں نہ اپنی زبان سے۔ اردو ہر زبان سے فیض حاصل کرتی رہی ہے اور کرتی رہے گی۔ اردو ہر زبان کو بہت کچھ دیتی رہے گی۔ یہ آزادانہ اور دوستانہ لین دین جاری رہے گا اور اسے جاری رہنا چاہیے۔ اردو بدلے گی بھی، نئے نئے الفاظ بھی لے گی اور خیالات بھی، اظہار کے سانچے بھی اور افکار کے ڈھانچے بھی۔ اس کے خمیر میں وسیع المشربی، کشادگی، وسعت قلب، قلندری اور آزادی ہے۔ یہ رسم خط دے کر زبان کا سودا کیوں کرے۔ آپ نے وہ پرانا قصہ سنا ہوگا، شاہ بادہ رخ بدہ ولا دام راہ مدہ۔ یہاں رخ دیتے ہیں تو وہ دام بھی جاتی ہے بلکہ رخ وہ دام کے پاسبان ہیں اور پاسبانوں کی نگہداشت ہر مستعد اور چوکنے ادارے کا فرض ہے۔ (باقی آئندہ)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، پرنٹر و پبلیشر سید تفضل حسین ایم اے نے نفیس کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھپایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا
REGD. NO. L. 922 فون نمبر ۲۹ R. NO. 2164/57